حشر ساماں

جمیل عثمان

نیو یارک کی کوئنز بولیوارڈ پر میں آھستہ آھستہ گاڑی چلا رہا تھا اور گردن گھما گھما کر دونوں طرف دیکھتا جا رہا تھا - میرے آگے پیچھے دور دور تک کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی - جولائی کا مہینہ تھا اور رات کے نو بج رہے تھے - مگر ہو کا عالم تھا - روشنیوں کے شہر میں روشنی تو تھی مگر پروانے نہیں تھے - کشادہ سڑکیں تو تھیں مگر دیوانے نہیں تھے - میکشوں سے بھرے ہوئے میخانے نہیں تھے - جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا وہ بازار نہیں تھے - دکانیں بند تھیں خریدار نہیں تھے - کچھ حسینائیں تھیں مگر طالب دیدار نہیں تھے -

شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہے - اور ایسی وبا جو نظر نہ آئے ، جو ذرا سی بد احتیاطی سے لگ جائے - ایسا مرض جس میں مبتلا شخص اگر آپ کے آگے کھانسے یا چھینکے تو آپ پکڑے گئے - اگر اس کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے مس ہو جائے تو سمجھیے آپ گئے - اس لئے سارے شہر نے دستانے پہن لئے ہیں اور چہروں پر نقاب ڈال لئے ہیں - لوگوں نے ایک دوسرے سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے - نہ مصافحہ ، نہ معانقہ ، نہ مکالمہ نہ معاشقہ! سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقید ہیں - اب تو سودا سلف لینے بھی کوئی دکان نہیں جاتا - آن لائن آرڈر کر دیے جاتے ہیں اور چیزیں دروازے پر ڈیلیور ہو جاتی ہیں - بڑے بڑے مالز بند ہو رہے ہیں اور دکاندار اپنی قسمت کو رو رہے ہیں - سینما ہالز اور تھیٹرز اجڑ گئے ہیں اور ریستورانوں کے دروازوں پر تالے پڑ گئے ہیں -

میری گاڑی ایک gated compound میں داخل ہوئی - بڑا سا کمپاؤنڈ تھا جس میں کوئی چالیس پچاس کے قریب ایک منزلہ عمارتیں تھیں- عمارتوں کے گرد کوئی دس فٹ اونچی فصیل تھی اور احاطے کے چاروں کونوں پر چار گیٹ تھے جہاں چیک پوائنٹس بنے ہوئے تھے - ہر چیک پوائنٹ پر ایک سیکیوریٹی گارڈ بیٹھا ہوتا تھا - میں نے گاڑی ایک چیک پوائنٹ پرروکی اور شیشہ گرایا - سیکیوریٹی گارڈ نے اپنی کھڑکی کھولی اور مجھ سے میرا نام پوچھا - میں نے نام بتایا -

"کس سے ملنا ہے؟"

"مسٹر شفیع نوری، ہاؤس نمبر **21**- میں نے جواب دیا -

اس نے انٹرکام سے صاحب خانہ سے رابطہ کیا اور ان کی اجازت پا کر مجھے اندر جانے کے لئے کہا اور ساتھ ہی شاید کوئی سوئچ دبایا جس سے گیٹ پر لگا ہوا سرخ و سفید دھاریوں والا ڈنڈا اٹھ گیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی - کمپاؤنڈ بہت خوبصورت تھا- صاف و شفاف سڑکیں ، ہر طرف گھنے درخت ، سڑک کے دونوں طرف کیاریوں میں رنگ برنگے پھول موسم بہار کی صحیح تصویر پیش کر رہے تھے - یہاں کے گھر خوبصورت آرکیٹکچر کا نمونہ اور رنگ و روغن سے آراستہ تھے - ہر عمارت بہت نفیس اور جاذب نظر تھی - کھڑکیاں اور دروازے تازہ کیے گیے رنگوں سے چمک رہے تھے - سڑکوں پر بجلی کے کھمبوں میں خوبصورت شیڈز کے نیچے فلوریسسنٹ بلب اپنی دودھیا روشنی سے راستوں اور ارد گرد کے ماحول کو منور کر رہے تھے - بجلی کے تار زیر زمین تھے اس لئے آسمان گنجلک تاروں کے جالوں سے آزاد تھا -

میں نے بلڈنگ 21 کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور اتر کر پچھلی سیٹ سے اپنا بریف کیس نکالنے لگا تو سڑک کی دوسری جانب سائیڈ واک پر چہل قدمی کرتا ہوا عمر رسیدہ جوڑا چلتے چلتے رک گیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا - میں اس وقت کوئی خلاباز لگ رہا تھا - سر سے پیر تک سفید رنگ کا اوور آل، چہرے پر ماسک اور اس پر فیس شیلڈ، ہاتھوں میں دستانے ، یہاں تک کہ جوتوں کے اوپر بھی سفید پلاسٹک کے کوورز چڑھائے ہوئے تھے - میں نے ہاتھ ہلایا تو اس جوڑے نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا - میں اپنا بریف کیس اٹھائے دروازے تک آیا اور گھنٹی بجائی - اندر سے کچھ آوازیں آئیں - کوئی کھانس رہا تھا - پھر قدموں کی چاپ سنائی دی، جیسے کوئی پیر گھسیٹ کر چل رہا ہو - دروازہ کھلا تو سامنے ایک ضعیف و نحیف بزرگ کھڑے تھے - لمبا قد ، دبلے پتلے، مدقوق چہرے پر لمبی نوکیلی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ ، کنپٹیوں اور سر کے پچھلے حصے پر سفید بال جو بڑھ کر گردن تک آ رہے تھے - میلی سی سفید شلوار قمیص اور ربر کی چپل پہنے ہوئے تھے- وہ مجھے

دیکھ کر جیسے چونک گئے اور شاید غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئے -

"گھبرائیے نہیں انکل،" میں نے نرمی سے کہا "میں ڈاکٹر سجاد احمد ہوں ، ضیا کا دوست-"

"اوہ ، اچھا ، اچھا،" ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور پھنس پھنس کر نکل رہی تھی، "آئیے ، آئیے - ضیاء نے فون کیا تھا کہ آپ آ رہے ہیں" - وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولے - میں اندر داخل ہو گیا تو انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور کچھ کہنے والے تھے کہ کھانسی آ گئی - شدید کھانسی ! ایسا لگ رہا تھا ان کا کلیجہ کھنچ کر باہر آ جائے گا - انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے منہہ پر رومال رکھا اور ایک جانب اشارہ کیا جہاں ایک صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا –

"آپ بیٹھیے میں آتا ہوں" انہوں نے کھانسی کے درمیان کہا اور قریب ہی ایک دروازے میں داخل ہو گئے جو شاید واش روم تھا - اندر سے کھانسنے اور کھنکارنے کے آوازیں آ رہی تھیں - میں سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا - ابھی میں باہر سے آیا تھا جہاں ہر طرف رنگ اور خوشبو کی فراوانی تھی ، جبکہ اندر ایک عجیب سی اداسی تھی - باہر کا ماحول خوشگوار تھا جب کہ اندر کا دلآزار - گھر میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی - کھڑکیوں کے پردے برابر تھے - پورے گھر میں مدھم سی روشنی تھی - بڑے صوفے پر ایک تکیہ اور میلا سا کمبل پڑا ہوا تھا - ساتھ ہی ڈائننگ ٹیبل تھا جس پر شیشیوں اور بوتلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے - میز کے ایک سرے پر جھوٹے برتن پڑے تھے - ایک جگ میں پانی اور ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا- اس سرے پر جو کرسی تھی اس کی پشت پر ایک تولیہ لٹک رہا تھا- اندر کے کمرے سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی -

وہ باہر آئے اور دور والی ایک کرسی پر بیٹھ گئے -

"مجھے ضیا نے بھیجا ہے کہ آپ کا اور بیگم صاحبہ کا ٹیسٹ کر لوں" -

"ضیا خود نہیں آئیں گے؟"

"انکل، مجھے معلوم نہیں - شاید مصروف ہوں"-

"ایسی بھی کیا مصروفیت کہ ماں باپ سے ملنے کا وقت نہیں ان کے پاس؟" وہ بھرائی آواز میں بولے -

"میں ان سے کہوں گا کہ آپ سے آ کر مل لیں" -

"ہاں بیٹا ، ضرور کہنا - پوتے کو بھی دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے" -

"جی ، ضرور ..." میں نے کہا اور تھوڑے توقف کے بعد بولا "میں دراصل نیو یارک کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں اور کورونا کے مریضوں کو دیکھتا ہوں"-

"اچھا!" انہوں نے کہا اور پھر کھانسنے لگے - جب کھانسی رکی تو بولے "کیا ہمیں بھی کورونا ہو گیا ہے؟"

"یہ تو ٹیسٹ کے بعد ہی معلوم ہو گا" - میں نے کہا ، حالانکہ ان کی حالت دیکھ کر مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں - میں نے تیلی جس کے سرے پر روئی کا پھاہا لگا ہوا تھا ، ان کے نتھنے میں ڈالی، ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا اور وہ بری طرح کھانسنے لگے - میں نے تیلی نکالی اور میز پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر ان کو دیا- انہوں نے پانی پیا اور تیز تیز سانس لینے لگے - ہم تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے - جب ان کی سانسیں درست ہوئیں تو میں نے کہا کہ "آنٹی کا بھی ٹیسٹ کرنا ہے"-

"ہاں ، آئیے" ، وہ اٹھتے ہوئے بولے -
ہم بیڈ روم میں گئے جہاں ضیا کی والدہ بستر پر پڑی تھیں -

"بیگم؟" شفیع صاحب نے آواز دی -

آہٹ سن کر انہوں نے گردن ہماری طرف گھمائ - پلکیں جھپکائیں اور دیکھنے کی کوشش کی ، مگر معلوم ہو رہا تھا وہ صاف نہیں دیکھ سکتی تھیں - ہاں اتنا دیکھ سکتی تھیں کہ دو آدمی ہیں -

"ضیا آیا ہے؟" ان کا کپکپاتا ہاتھ اوپر اٹھا -

"نہیں ، ڈاکٹر صاحب ہیں - ہمارا ٹیسٹ کرنے آئے ہیں"-

"ضیا کیوں نہیں آیا؟" خاتون نے نحیف آواز میں پوچھا -

"مجھے نہیں معلوم"-

"کب آئے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم " - اس بار شفیع صاحب کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی -

میں نے ضیا کی والدہ کا بھی سیمپل لیا - ان کا گلا بھی بری طرح خراب تھا اور رہ رہ کر کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے - وہ اتنی دبلی تھیں کہ لگتا تھا بستر پر کوئی ہے ہی نہیں -

میں کمرے سے باہر آیا - شفیع صاحب میرے پیچھے پیچھے آئے - جتنی دیر میں بریف کیس میں چیزیں رکھتا رہا وہ بس یہی کہتے رہے کہ "ضیا سے کہنا ہم سے ملنے آئے، یا ہمیں بلا لے" -

میں نے ان سے وعدہ کیا - اپنا بریف کیس سنبھالا اور باہر آ گیا - تازہ ہوا ملی تو میں نے ذرا دیر کے لئے چہرے سے شیلڈ اور ماسک ہٹایا اور گہری گہری سانسیں لیں - آس پاس کوئی نہیں تھا اس لئے کوئی خطرہ نہیں تھا - اندر کی گھٹن سے باہر آنے کے بعد ایک خوش گوار احساس ہو رہا تھا ، مگر ضیاء کے والدین کی حالت سے تکلیف بھی ہو رہی تھی -

ٹیسٹ کے نتائج آئے تو میرا اندازہ درست نکلا - شفیع صاحب اور ان کی بیگم کو وائرس نے پکڑ لیا تھا اور بہت خطرناک حد تک پھیل چکا تھا - میں نے فوراً ضیاء کو فون کیا -

"تمہارے والدین وائرس میں مبتلا ہیں" -

"اوہ، یا اللہ خیر" -

"فوری طور پر انہیں ہسپتال میں داخل کراؤ" -

"بہت بہتر"-

"کل میری ER میں ڈیوٹی ہے - تم کل ہی انہیں داخل کرا دو تاکہ میں اپنے سامنے تمام کارروائیاں مکمل کروا دوں -

دوسرے دن ضیاء اپنے والدین کو لے آیا - انہیں فوری طور پر ایمرجنسی میں داخل کر دیا گیا - میں نے ڈیوٹی پر موجود اسٹاف سے کہا کہ وہ ان دونوں کے داخلے کے لئے ضروری کاغذی کارروائیاں مکمل کریں اور پھر دوسرے مریضوں کو دیکھنے چلا گیا - گھنٹے بھر بعد واپس آیا تو تمام کام مکمل ہو چکے تھے - میں اس کی والدہ کے بیڈ کے پاس گیا اور انہیں چیک کیا - ضیاء بھی وہیں تھا - ان کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا - وہ بول نہیں سکتی تھیں لیکن ان کی ساری ممتا ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی - وہ ایک ٹک ضیاء کو دیکھے جا رہی تھیں - ان کے لب خاموش تھے مگر آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں - آنکھیں، جن میں حسرت تھی، محبت تھی، کرب تھا، التجا تھی - آنکھیں، جو چھلکی پڑ رہی تھیں اور ان کے کناروں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے -

"اماں، اب آپ آرام سے رہیے ، سجاد آپ کا بہت خیال رکھے گا" ضیاء نے میری طرف اشارہ کیا - "میں جلد ہی آؤں گا" - مگر وہ تو بس اسے دیکھے جا رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے -

ضیاء پھر اپنے باپ کے بیڈ کے پاس آیا اور ان سے بھی وہی باتیں کہیں، "آپ ٹھیک ہو جائیں گے - میں جلد ہی آؤں گا" وغیرہ وغیرہ - ان کے منہہ پر ابھی ہسپتال والا ماسک نہیں لگایا گیا تھا اور نارمل ماسک جو سب پہنتے ہیں لگا ہوا تھا - انہوں نے ملتجیانہ نظروں سے ضیاء کو دیکھا اور بولے:

"بیٹا، جب ہم ٹھیک ہو جائیں گے تو کیا تمہارے گھر آ کر رہ سکیں گے؟" میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا - یا اللہ یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے پوچھ رہا ہے کہ وہ اس کے گھر رہ سکتا ہے کہ نہیں -

ضیاء کہہ رہا تھا "آپ ٹھیک تو ہو جایئے پہلے" - اور وہ ہانپتے ہوئے ، کھانسیوں کے درمیان کہہ رہے تھے:

"ہم ... بیسمنٹ میں رہ لیں گے بیٹا ... اوپر نہیں آئیں گے ... بیسمنٹ کا دروازہ بیک یارڈ میں کھلتا ہے نا ... منا جب کھیلنے آئے گا ... تو ہم ... دروازے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھ لیا کریں گے ... اس کے قریب نہیں جائیں گے، اسے پیار نہیں کریں گے" -

ضیاء صرف سر ہلا کر رہ گیا - اس نے کچھ کہا نہیں - بس اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا - مجھے معلوم تھا اس کے والدین اگر ٹھیک ہوتے تب بھی اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے - اور ابھی تو وہ ایک خطرناک وبائی مرض میں مبتلا تھے -

ضیاء پھر نہیں لوٹا - اس کے والدین کی حالت دن بہ دن بگڑتی گئی - دو دن کے بعد اماں کو اور ایک ہفتے کے بعد ابا کو بھی وینٹیلیٹر پر ڈال دیا گیا - ان دونوں کو ہسپتال میں داخل ہوئے جب دو ہفتے ہو گئے تو میں نے ضیاء کو فون کیا اور کہا کہ وہ آ کر ان سے مل لے - ان کی حالت بہت خراب ہے -

دو دنوں کے لئے میری ڈیوٹی کسی دوسرے ہسپتال میں لگا دی گئی - وہاں سے واپس آکر جب میں اپنے ہسپتال کام پر جا رہا تھا تو گاڑی سے ہی ضیاء کو فون کیا کہ وہ ہسپتال آ کر اپنے والدین سے مل لے -

ہسپتال پہنچ کر میں دوسرے وارڈز میں مریضوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا اور اس وارڈ کی طرف جانے کا موقع ہی نہیں ملا جس میں شفیع صاحب اور ان کی بیگم تھے - سہ پہر تین بجے کے قریب میرے فون کی گھنٹی بجی - ضیاء نے کہا کہ وہ لابی میں میرا انتظار کر رہا ہے - دس منٹ بعد میں اس کے پاس گیا اور اسے لے کر اس وارڈ کی طرف چلا جہاں اس کے والدین تھے - پہنچے تو دیکھا کہ دونوں بستروں پر دوسرے مریض ہیں - میں نے انچارج نرس سے پوچھا تو اس نے تحقیق کرنے کے بعد کہا:

"They died yesterday six hours apart from one another."

پھر اس نے سوال کیا، "کون تھے وہ لوگ؟"

"میرے دوست کے والدین" میں نے ضیاء کی طرف اشارہ کیا -

"آئی ایم سوری،" اس نے ضیاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا - ہم نے فون کیا تھا لیکن آپ لوگوں سے رابطہ نہیں ہو سکا - مسیج چھوڑنا چاہا مگر وائس میل باکس فل تھا - اگر ورثا فوری طور پر لاش نہ لے جائیں تو انہیں اجتماعی قبروں میں تدفین یا پھر نذر آتش کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے"-

ضیاء کانپنے لگا - اگرچہ اس سے پہلے میں کورونا وائرس سے بے شمار اموات دیکھ چکا تھا اور میرا دل سخت ہو چکا تھا ، لیکن اس وقت میری حالت بھی غیر ہو رہی تھی - میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ضیاء کا ہاتھ پکڑ کر مردہ خانے کی طرف بھاگا - وہاں کے انچارج کو دونوں کی تفصیلات بتائیں - وہ کمپیوٹر پر کچھ دیکھتا رہا اور پھر ہمیں اطلاع دی کہ گزشتہ کل آنے والی لاشوں کو آج صبح کنٹینرز میں رکھ دیا گیا ہے - اب وہ روانہ ہونے والے ہوں گے -

"آؤ،" میں نے ضیاء سے کہا اور ہسپتال کے پچھلے حصے کی طرف دوڑ لگائی - وہاں دو ریفریجریٹڈ کنٹینرز کھڑے تھے - میں نے وہاں کے انچارج سے کہا کہ میرے دوست کے والدین کی لاشیں یہاں لائی گئی ہیں ، کیا

ہمیں تدفین کے لئے مل سکتی ہیں - اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور افسوس سے سر ہلانے لگا -

"میرے ساتھ آؤ،" وہ ہمیں لے کر کنٹینرز کی طرف گیا - ان کے دروازے کھلے ہوئے تھے -

"کیا تم انہیں تلاش کر سکتے ہو؟" اس نے دونوں کنٹینرز کی طرف اشارہ کیا –

ان میں سفید چادروں میں لپٹی لاشیں اس طرح ایک دوسرے پر رکھی ہوئی تھیں جیسے اناج کی بوریاں -

ضیاء سر پکڑ کر وہیں اکڑوں بیٹھ گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا -